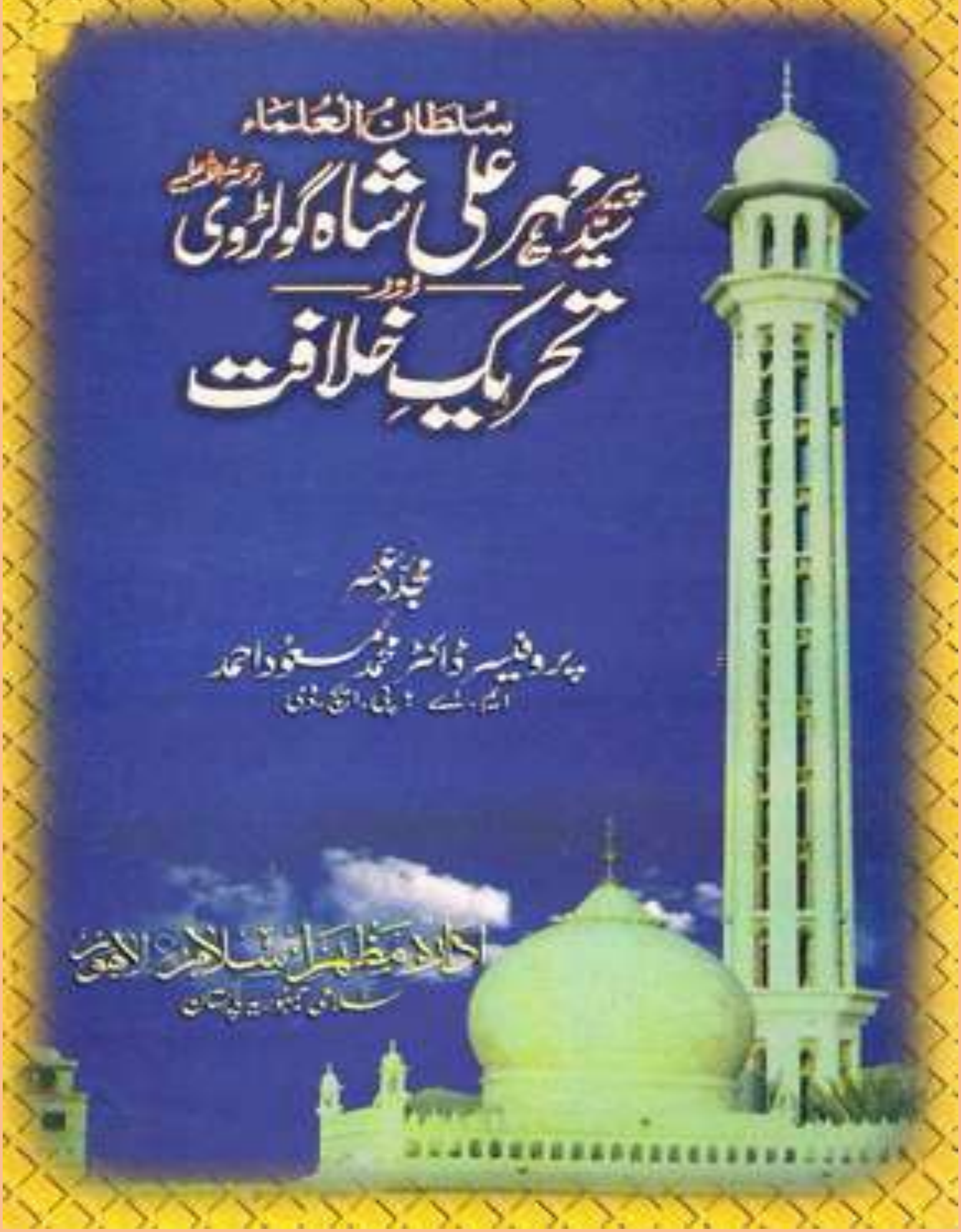

سلطان العلماء
سیّد مہر علی شاہ گولڑوی رحمۃ اللہ علیہ
اور
تحریکِ خلافت
پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد
ایم۔ اے، پی۔ ایچ۔ ڈی
ادارۂ مظہرِ اسلام لاہور

بسم اللہ الر حمٰن الر حیم

حضرت سلطانُ العلماء پیر مہر علی شاہ گولڑوی علیہ الرحمۃ اپنے علم و فضل اور عشقِ رسول کی بدولت پاک وہند میں جانے پہچانے جاتے ہیں۔ ان کی پنجابی نعت کا یہ مصرع ؎

ع کتھے مہر علی کتھے تیری ثناء
گستاخ اکھیاں کتھے جا اڑیاں

دِلوں کو گرما بھی رہاہے اور برما بھی رہاہے۔ جذبات محبت کا ایک چشمہ ہے جس سے تاثیر کے فوارے پھوٹ رہے ہیں۔ بلاشبہ حضرت سلطانُ العلماء ان برگزیدہ ہستیوں میں تھے جن کیلئے کہا گیاہے:۔

سالہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تاز بزم عشق یک دانائے راز آید بروں

سلسلہ نسب

حضرت سلطانُ العلماء خاندانِ سادات کے چشم وچراغ تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب پچیس [۲۵] واسطوں سے حضرت غوثِ اعظم شیخ محی الدین عبد القادر جیلانی علیہ الرحمۃ سے ملتاہے، اور چھتیس [۳۶] واسطوں سے حضرت سیّدنا امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے۔

ولادتِ با سعادت

آپ کی ولادتِ باسعادت یکم رَمضانُ المبارک ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۴/ اپریل ۱۸۵۹ء میں بروز پیر گولڑہ شریف میں ہوئی۔ گولڑہ شریف، راولپنڈی (پاکستان) سے گیارہ میل کے فاصلے پر کوہِ مارگلہ کے دامن میں واقع ہے۔ پاکستان کا دار السلطنت اسلام آباد اس کی مشرقی حدود سے متصل ہے۔

تعلیم و تربیت

آپ نے ابتدائی تعلیم اپنے علاقے میں حاصل کی، چنانچہ گولڑہ شریف میں مولانا غلام محی الدین سے پڑھا، پھر حسن ابدال میں مولانا محمد شفیع قریشی سے اور ضلع سرگودھا میں مولانا سلطان محمود سے علوم عقلیہ و نقلیہ کی تحصیل کی۔ آپ مولوی سلطان محمود کے ساتھ سیال شریف بھی حاضر ہوتے تھے، چونکہ آپ کے استاد محترم خواجہ شمس الدین سیالوی علیہ الرحمۃ سے بیعت تھے۔ یہ آنا جانا ایسا مبارک ثابت ہوا کہ سیال شریف مستقبل میں آپ کا پیر خانہ بن گیا اور آپ خواجہ محمد دین سیالوی علیہ الرحمۃ سے بیعت ہو گئے۔

حضرت سلطانُ العلماء نے پندرہ[۱۵] سال کی عمر تک پنجاب و سرحد میں تعلیم حاصل کی پھر ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں ہندوستان تشریف لے گئے اور علی گڑھ میں فاضل جلیل مولانا لطف اللہ علی گڑھی کے مدرسے میں اڑھائی سال ۱۲۹۰ھ تا ۱۲۹۳ھ (۱۸۷۳ء تا ۱۸۷۶ء) تعلیم حاصل کی اور امتحان میں خاص امتیاز حاصل کیا۔ بڑے ذہین و فطین تھے۔ اقلیدس (جیومیٹری) کا پرچہ حل کیا تو خود اشکالات و اعتراضات وارد کئے، پھر خود جوابات تحریر فرمائے، یہ دیکھ کر ممتحن حیران رہ گئے، سر سید احمد خاں کو جب اس کا علم ہوا تو وہ بھی متعجب ہوئے۔ نہ صرف امتحان بلکہ درس کے دوران بھی وہ اپنے اساتذہ سے بڑے دقیق سوالات کیا کرتے تھے، ایک دفعہ مدرسہ علی گڑھ میں مولانا عبد اللہ ٹونکی تشریف لائے، جو اپنے عہد کے جلیل القدر عالم تھے۔ ان سے علم نحو کی کتاب "کافیہ" پر سوال و جواب ہوئے تو مولانا لطف اللہ علی گڑھی نے صحاح ستہ کتب حدیث کی اجازت دی جو ان کو مولانا آل احمد بن محمد امام بن نعمت اللہ پھلواری سے ملی تھی، اس کے علاوہ قرآن و تفسیر کی بھی اجازت دی جو قاری عبد الرحمٰن پانی پتی سے ملی تھی۔

حضرت سلطانُ العلماء سہارنپور میں مولوی احمد علی سہارنپوری کے درس میں بھی شریک ہوئے۔ مولانائے موصوف محمد علی مونگیری اور مولوی محمود حسن دیوبندی کے استاد تھے۔ مدرسہ سہارنپور میں سلطانُ العلماء کے ہم سبق محدث جلیل مولانا وصی احمد محدث سورتی بھی رہے۔ مولانائے موصوف امام احمد رضا خاں بریلوی کے مخصوصین میں تھے، دونوں میں بڑا چاؤ اور لگاؤ تھا۔ مدرسہ سہارنپور میں سلطان العلماء اور محدث سورتی کے علاوہ سب طلبہ غیر مقلد تھے، اسی لئے سلطان العلماء ایسی احادیث پر عالمانہ بحث فرماتے جس سے مذہبِ حنفی کی تائید ہوتی، اس لئے غیر مقلد طلبہ بہت پریشان رہتے۔

سلطانُ العلماء ۱۲۹۰ھ سے ۱۳۰۰ھ (۱۸۷۳ء تا ۱۸۸۲ء) تک ہندوستان میں علوم منقولہ و معقولہ کی تحصیل کرتے رہے، پھر ۱۳۰۰ھ ہی میں وطن عزیز گولڑہ شریف واپس آ گئے۔ اس زمانے میں آپ کے والد ماجد کے ماموں سیّد فضل دین شاہ گیلانی علیہ الرحمۃ (م ۱۳۱۱ھ / ۱۸۹۲ء) اور والد ماجد سیّد نذر دین شاہ علیہم الرحمۃ (م ۱۳۲۳ھ / ۱۹۰۴ء) بقید حیات تھے۔ دونوں کے زیر سایہ فکرِ معاش سے بے نیاز ہو کر سلطانُ العلماء درس و تدریس میں مصروف رہے۔ معقولات میں قاضی مبارک کا ایسا درس دیتے کہ علماء حیرت زدہ رہ جاتے۔ انھیں ایام میں آپ کی شادی ہو گئی۔

بیعت، اجازت و خلافت

حضرت سلطانُ العلماء سلسلۂ چشتیہ میں حضرت خواجہ محمد دین سیالوی علیہ الرحمۃ (۱۳۰۰ھ / ۱۸۸۲ء) المعروف بہ "حضرت ثانی" سے بیعت ہوئے اور مدارج سلوک طے کر کے اجازت و خلافت حاصل کی۔ آپ کو اپنے شیخ سے بے پناہ محبت تھی، ۱۳۰۰ھ میں جب سلطانُ العلماء کے شیخ طریقت حضرت خواجہ محمد دین سیالوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا وصال ہوا تو آپ پر جذب و مستی کی کچھ ایسی کیفیت طاری ہو گئی کہ گھر کو خیر باد کہا اور سیاحت پر نکل گئے۔ لاہور، مالیر، کوٹلہ، ملتان، ڈیرہ غازی خاں، مظفر گڑھ، اجمیر شریف، حسن ابدال وغیرہ گئے۔ پھر ۱۳۰۷ھ میں سلطانُ العلماء حج بیت اللہ شریف اور زیارت حرمین شریفین کی سعادت سے مشرف ہوئے۔ انہی ایام میں حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۳۱۷ھ / ۱۸۹۹ء) نے آپ کو سلسلۂ چشتیہ صابریہ میں اجازت مرحمت فرمائی۔ حضرت حاجی صاحب نے راقم کے جد امجد حضرت محمد مسعود شاہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ (م ۱۳۰۹ھ / ۱۸۹۲ء) سے بھی روحانی فیض حاصل کیا تھا جو حضرت سیّد امام علی شاہ علیہ الرحمۃ مکان شریفی کے اجلّہ خلفاء میں تھے۔ مکہ معظمہ میں آپ حاجی صاحب کے درس میں بھی شریک ہوئے۔ ایک روز فراق و وصال پر آپ نے عارفانہ تقریر فرمائی تو حاجی صاحب بہت محظوظ ہوئے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ مکہ معظمہ میں حضرت سلطانُ العلماء کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا گیا، چنانچہ قاری عبد اللہ مہاجر مکی نے جب آپ کو خط لکھا تو ان القاب سے یاد کیا:۔

- قطب الاقطاب
- غوث الانجاب
- جامع علوم
- حقیقیہ شرعیہ
- مشرق آفتاب رشاد ...... وغیرہ وغیرہ۔

سفر حرمین شریفین سے واپسی پر آپ بھوپال تشریف لے گئے اور وہاں کچھ عرصے درس و تدریس میں مصروف رہے، پھر وطن عزیز گولڑہ شریف آ گئے۔

مزاج و مسلک

حضرت سلطانُ العلماء کا مسلک سلجھا ہوا اور طبیعت بھی سلجھی ہوئی تھی، آپ مشرباً چشتی، مسلکاً حنفی اور سلفاً صالحین کے پیرو تھے طبیعت پر جمال غالب تھا، اختلافات کے باوجود مسلکِ دیوبند کے علماء بھی آپ سے عقیدت رکھتے تھے۔ آپ ۱۳۰۷ھ / ۱۸۸۹ء میں مسند ارشاد پر رونق افروز ہوئے اور نصف صدی تک ایک عالَم کو سیراب و سرفراز فرمایا۔

معاندین کا تعاقب

آپ نے مرزائیت، شیعیّت، وہابیّت، نیچریت، دیوبندیّت کا ردّ بلیغ فرمایا۔ سنّیت اور مدارس اہل سنت کیلئے آپ کی مساعی جمیلہ ناقابلِ فراموش ہیں۔

آپ:۔

امکان کذب باری تعالیٰ کو محال، علمِ غیب عطائی اور سماعِ موتیٰ کو برحق، ندائے یارسول اللہ، زیارتِ قبور، توسل و استمداد انبیاء واولیاء، بزرگوں کے نام پر قربانیوں اور ایصالِ ثواب کو جائز سمجھتے تھے اور اس کیلئے وزنی دلائل رکھتے تھے۔

معبودان باطل اور بتوں کے متعلق جو آیات نازل ہوئیں ان کو انبیاء اولیاء پر منطبق کرنے کو تحریف و تخریب سے تعبیر فرماتے تھے۔ آپ نے ابن عبد الوہاب نجدی اور مولوی اسماعیل دہلوی کے گستاخانہ کلمات کا تعاقب فرمایا اور ان کا ردّ بلیغ فرمایا۔

شدّ رِحال والی حدیث کی روشنی میں ابن تیمیہ اور ابن عبد الوہاب نے مسلمانوں کو روضہ ٔ رسول علیہ التحیۃ والتسلیم کی زیارت سے روکنے کی پوری پوری سعی کی۔ حضرت سلطانُ العلماء دونوں حضرات کے دلائل کو باطل قرار دیتے تھے اور روضہ ٔ رسول علیہ التحیۃ والتسلیم اور مزاراتِ اولیاء پر حاضری کو جائز اور باعثِ اجر و ثواب سمجھتے تھے۔ ایک عاشق، دل کی لگی میں جاتا ہے، نہ معلوم کسی کا کیا جاتا ہے! ابن عبد الوہاب نے اپنی تحریک کے زمانے میں اہل مکہ کے نام اپنا دعوتی پیغام بھیجا۔ وہ اہل مکہ جو اہلِ سنت و جماعت کے عقائد پر سختی سے کاربند تھے اور سلف صالحین کے سچے پیرو تھے۔ اس پیغام میں وہ اہل مکہ سے یوں خطاب فرماتے ہیں:۔

"جو شخص نبی کو اپنا ولی اور شفیع سمجھتا ہے' وہ اور ابو جہل، شرک میں برابر ہیں۔ جو شخص اپنی حاجت کے وقت "یا محمد" کہتا ہے اگرچہ ان کے متعلق سب باتوں میں عاجز ہونے کا اعتقاد رکھتا ہو تو بھی شرک ہو جاتا ہے۔"

پھر لکھا ہے:۔

"پہلے بُت "لات" اور "سواع" اور "عُزّیٰ" تھے اور پچھلے بت محمّد، علی اور عبد القادر ہیں۔" [1]

یہ تھی ابن عبد الوہاب کی دعوت جن کے متعلق مولوی رشید احمد گنگوہی تحریر فرماتے ہیں کہ

"ان کے عقائد اچھے تھے گو مزاج کے سخت تھے"۔

---

[1] فیض احمد فیض، مولانا: مہر منیر، ص ۲۶۲۔ مطبوعہ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء۔

شاید ان کو اندازہ نہ تھا کہ انہوں نے خود حضورِ انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان میں یہ جو فرمایا ہے ۔

شفیع عاصیاں ہو تم وسیلہٗ بے کساں ہو تم
تمہیں چھوڑ کر اب کہاں جاؤں بتاؤ یا رسول اللہ

ابن عبدالوہاب کے فتوے کی زد میں آرہا ہے اور نہ صرف وہ بلکہ اس میں مولوی اشرف علی تھانوی بھی ان کے شریک ہیں، جنہوں نے سرکارِ دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شانِ اقدس میں فرمایا ۔

ليس لى ملجاء سواك اغث
مسّنى الضرّ سيدى سندى [1]

المختصر آپ کے زمانے میں وہابیت نے سر اُٹھایا جس کی آپ نے سرکوبی فرمائی، پاک پتن شریف میں عرس کے موقع پر درگاہ شریف معاندین کا مرکز رہتی۔ یہاں آپ نے ان لوگوں سے کئی کامیاب مباحثے فرمائے۔ شائد قارئین کرام کو یہ پڑھ کر تعجب ہو کہ وہابیہ نے درگاہ شریف کو کیوں مرکز بنایا تھا۔ اس کے دو فائدے تھے:۔

1 ایک تو یہ جو اہلسنّت قریب ہیں، ان کو تقریر و ترغیب سے اپنا ہم خیال بنایا جائے۔

2 دوسرا فائدہ یہ تھا کہ جو اہل سنت دور ہیں وہ یہ سمجھتے رہیں کہ جب درگاہ شریف اس جماعت کا مرکز ہے تو یقیناً یہ جماعت عقائدِ اہل سنت رکھتی ہوگی، اس طرح اہل سنت قریب آتے جائیں گے اور کام پھیلتا جائے گا۔

چنانچہ یہ حضرات ابتداء میں کسی اختلافی مسئلہ پر بات نہیں کرتے بلکہ مصلحتاً اگر صلوٰۃ و سلام کیلئے کھڑا رہنا پڑے تو کھڑے ہو جاتے ہیں جس سے یہ تاثر قائم کرتے ہیں کہ ہم تو عاشقِ رسول اور اہل اللہ کے ماننے والے ہیں، حالانکہ ان کے مقاصد عالیہ میں خانقاہوں اور درگاہوں کا اُجاڑنا شامل ہے جس کا راقم کو ذاتی تجربہ ہے۔ اس جماعت کے ایک ذِمہ دار فرد نے راقم کو اپنا سمجھ کر سرگوشی کے انداز میں کہا:۔

"فلاں شہر میں جو خانقاہ تھی ہماری جماعت نے اُجاڑدی، مریدین منتشر ہو گئے اور پیر صاحب روانہ ہو گئے۔"

راقم کی آنکھیں کھل گئیں اور ان الزامات کی تصدیق ہو گئی جو اہلسنّت کی طرف سے لگائے جاتے تھے۔ ایک انگریز جاسوس کی یادداشت پڑھی تھی جس میں برطانیہ کے محکمہٗ جاسوسی نے اس کو جو ہدایات دی تھیں ان میں ایک ہدایت یہ بھی تھی کہ

"مسلمانوں کو اہل اللہ کے مزاروں سے دور رکھا جائے۔ کہ یہ مزارات قوت کا سرچشمہ ہیں اور مسلمانوں کو یہ باور کرایا جائے کہ مزارات پر حاضری کفر و شرک ہے۔"

---

[1] فیض احمد فیض، مولانا: مہر منیر، ص ۲۶۳۔ مطبوعہ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء۔

حیرت کی بات ہے دشمنانِ اسلام کے مقاصد ہمارے ہاتھوں پورے ہو رہے ہیں۔ حضرت سلطانُ العلماء ایک دیدہ ور مصلح تھے، وہ جانتے تھے کہ جن عقائد کی اس زمانے میں تشہیر کی جارہی تھی اس کا فائدہ دشمنوں کو پہنچے گا، مسلمانوں کو نہیں۔ اسی لئے آپ نے ان تمام عقائد کی پرزور تردید فرمائی جس سے دشمنانِ اسلام کے ہاتھ مضبوط ہوتے۔

حضرت سلطانُ العلماء کی طبیعت میں استغناء تھا۔

ع کہ ہے استغناء میں معراج مسلمانی

یہی وجہ ہے کہ ۱۹۱۱ء میں جب شاہ برطانیہ نے دہلی میں دربار لگایا اور آپ کو بھی دعوت دی گئی تو آپ تشریف نہ لے گئے۔ آپ کے رگ و ریشے میں اسلام اور شارع اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام کی محبت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، یہی وہ محبت ہے جس سے مشرک و مسلم میں فرق کیا جاسکتا ہے۔ گستاخِ رسول راجپال کو جب برطانوی عدالت نے بری کیا تو سلطانُ العلماء نے وائسرائے ہند کو یہ تار بھیجا:۔

"مسلمان قوم ہزار اختلافات کے باوجود ناموسِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے محاذ پر یک جان ہو کر لڑے گی اور کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہ کرے گی۔"[1]

اسی عشقِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وجہ سے آپ عوام و خواص میں مقبول و محبوب تھے اور یہی عشقِ رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تھا کہ جب ۱۹۰۰ء میں آپ قادیانیوں سے مناظرے کیلئے لاہور تشریف لے گئے تو یوں معلوم ہوتا تھا کہ پورا شہر اُمنڈا چلا آرہا ہے۔

---

[1] فیض احمد فیض، مولانا: مہر منیر، ص ۱۴۴۔ مطبوعہ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء۔

آپ کا سیاسی کردار

حضرت سلطانُ العلماء نے کبھی سیاست میں حصہ نہ لیا لیکن جب ناعاقبت اندیش لیڈروں نے سیاست میں اسلام کو ملوث کیا اور شریعت کو پامال کیا تو آپ خاموش نہ رہے۔ سیاست میں آپ نہایت ہی حزم واحتیاط کے قائل تھے جس کا اندازہ ان کلمات سے ہوتا ہے جو آپ نے اپنے آخری ایام میں صاحب زادۂ گرامی شاہ غلام محی الدین علیہ الرحمۃ کے استفسار کے جواب میں ارشاد فرمائے۔ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج لاہور کی تحریک چلی اس تحریک میں شرکت کیلئے جب صاحب زادہ موصوف نے حضرت سلطانُ العلماء سے اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:۔

"کوئی قدم ایسا نہ اُٹھانا جو واپس لینا پڑے۔ نہ تو لوگوں سے اس قدر علیحدگی اختیار کرنا کہ نشانہ بنالیں اور نہ ایسا اختلاط کرنا کہ اپنا شغل بھی ترک ہو جائے۔" [۱]

آپ کے ارشادات دورِ جدید کے مسلمان سیاست داں بالخصوص علماء کیلئے مشعلِ راہ ہوسکتے ہیں۔ ان چند کلمات میں جہانِ معنی آباد ہے اور برسوں کے تجربے سموئے ہوئے ہیں۔

حضرت سلطانُ العلماء کے زمانے میں ۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلاف چلی اور اسکے بعد ۱۹۲۰ء میں گاندھی نے تحریکِ ترکِ موالات شروع کی پھر کئی اور تحریکیں چلیں مثلاً:

1. تحریک ترک گاؤکشی،
2. تحریک کھدّر،
3. تحریک ہجرت وغیرہ۔

چونکہ ان تحریکوں میں اسلام کو ملوث کیا گیا، احکامِ شریعت کو پامال کیا گیا اور مسلم مفادات کو نقصان پہنچایا گیا اس لئے آپ نے شرعی وجوہ کی بناء پر ان تحریکوں کی مخالفت کی۔

تحریکِ خلافت کا ایک طویل پس منظر ہے اور پھر ایک طویل پیشِ منظر۔ اس لئے ہم مختصراً پہلے اس تحریک کا پس منظر پیش کریں گے اور پھر پیش منظر اور پھر اس کے نتائج کا ذکر کریں گے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ حضرت سلطانُ العلماء ایک عارف کامل اور فاضل جلیل عالم ہی نہیں ایک دیدہ ور مدبر بھی تھے۔

---

[۱] فیض احمد فیض، مولانا: مہر منیر، ص ۱۴۵۔ مطبوعہ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء۔

تحریکِ خلافت کا پس منظر

سلطنتِ عثمانیہ مسلمانوں کی ایک عظیم سلطنت تھی عقائد میں اہل سنت و جماعت اور سلف صالحین کی پیرو تھی اور دُنیا کی ایک بڑی قوت تھی جس کا کوئی مد مقابل نہ تھا۔ یہ سلطنت دنیا کے چار بر اعظموں پر پھیلی ہوئی تھی، اس کی ہیبت سے یورپ کانپتا تھا۔ اس کی تباہی و بربادی کیلئے تدبیریں سوچی جانے لگیں اور ایک تدبیر یہ سمجھ میں آئی کہ مسلمانوں میں نئی سیاسی اور دِینی قوت کو جنم دیا جائے۔ اس کیلئے جزیرۂ عرب کو انتخاب کیا گیا چنانچہ برطانیہ کے وزارت نو آبادیات کے محکمۂ جاسوسی نے اس مشن کیلئے جاسوس روانہ کیے، جنہوں نے علاقائی عصبیتوں کو جگا کر مقامی لوگوں کو ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ کیا اور سلف صالحین کے خلاف نئے دینی رہنماؤں کو ہموار کرکے دینی سطح پر انتشار پیدا کیا اس طرح دیکھتے ہی دیکھتے وہ سلطنت جو دنیا کے بڑے علاقے پر پھیلی ہوئی تھی سیاسی انتشار اور مذہبی اختلال کی وجہ سے سمٹنے لگی اور بالآخر ختم ہو کر ایک جمہوری حکومت کی صورت میں نمودار ہوئی جس کا کوئی سرکاری مذہب نہ تھا۔ مغربی طاقتوں کا یہی مدعا تھا جو انہوں نے سازشوں کا جال پھیلا کر حاصل کر لیا۔

اسلامی دنیا میں سلطان ترکی کو مقاماتِ مقدسہ کے خادم اور بڑی اسلامی مرکزی سلطنت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے "خلیفۃ المسلمین" کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ جب اتحادیوں نے اس سلطنت کو پارہ پارہ کر دیا تو فطری طور پر ہندوستان کے سنّی مسلمانوں کو اس سلطنت کو سُنّیت اور اسلامی شوکت کی آخری یادگار خیال کرتے تھے، سخت صدمہ ہوا۔ ۱۹۰۸ء میں سلطان عبدالحمید خاں کو معطل کیا گیا، یہ معزولی سلطنتِ عثمانیہ کے زوال اور انتشار کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔ اس وقت سلطنت ترکیہ بحیرہ عرب سے بلغاریہ اور طرابلس تک پھیلی ہوئی تھی۔ سلطان عبدالحمید کی معزولی کے بعد بلغاریہ ہاتھ سے گیا، پھر آسٹریا نے ترکی علاقوں پر قبضہ کر لیا، ۱۹۱۰ء میں اٹلی نے دول مغرب کے اشاروں پر طرابلس میں جنگ چھیڑ دی اور کافی علاقے ترکوں کے ہاتھ سے نکل گئے۔ پھر ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم دوم شروع ہونے پر ترکوں نے جرمنی کا ساتھ دے کر رہی سہی قوت بھی کھو دی۔ اتحادیوں نے عرب ممالک میں بغاوت کرا کے ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء کے درمیان بتدریج شام، حجاز، فلسطین، عراق سب علیحدہ کرا لیے اور یہ عظیم سلطنت مختصر سے علاقوں پر محدود ہو کر رہ گئی۔ ۱۹۱۹ء میں جنگ عظیم ختم ہونے کے بعد جب اتحادیوں نے ترکیہ کو آپس میں تقسیم کرنا شروع کیا تو ہندوستان کے مسلمان بپھر گئے اور ہندو بھی۔

اصل میں بات یہ تھی کہ دوسری جنگ عظیم (۱۹۱۴ء۔۱۹۱۸ء) کے موقع پر انگریزوں نے ہندوستانی لیڈروں سے وعدہ کیا تھا کہ اگر انہوں نے جنگ میں برطانیہ کی مدد کی تو اس کے صلے میں جنگ جیتنے کے بعد ہندوستان کو آزادی دے دی جائے گی، چنانچہ وہی لیڈر جو بعد میں انگریزوں کے سخت خلاف ہوئے انگریزوں کی مدد کیلئے انہوں نے دن رات ایک کر دیئے، گاندھی اور محمد علی جوہر نے برطانوی فوج میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو خوب بھرتی کرایا حالانکہ انگریزوں کی جنگ ترکوں کے خلاف تھی مگر ہندوستان لیڈروں کو حقیقت میں ہندوستان کی آزادی مطلوب تھی ترکوں سے کوئی سروکار نہ تھا۔

تحریکِ خلافت کا اصل مقصود

۱۹۱۸ء میں جب جنگِ عظیم ختم ہوئی تو انگریزوں نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا۔ جس سے ہندوستانی لیڈر برا فروختہ ہو کر انگریزوں سے انتقام لینے پر آمادہ ہوگئے۔ چنانچہ انگریزوں کے خلاف ایک بھرپور تحریک چلائی جس کو تحریکِ خلافت کا نام دیا جاتا ہے۔ اس تحریک میں اہل سنت و جماعت کا خوب استحصال کیا گیا۔ سیاست داں اپنے مقاصد کی تکمیل کیلئے کبھی عوام الناس کے دینی جذبے کو اُبھارتے ہیں، کبھی علاقائی جذبے کو، کبھی لسانی جذبے کو۔ تحریکِ خلافت میں اہل سنت و جماعت کے دینی جذبے کو اُبھارا گیا جس سے تحریک میں جان آگئی اور ساتھ ہی یہ باور کرایا گیا کہ سلطنت ترکیہ، خلافتِ اسلامیہ ہے جس کی حفاظت کیلئے تن من دھن کی قربانی ہر مسلمان پر فرض ہے۔ قوی ضعیف کی مدد کر سکتا ہے، جو خود ضعیف ہے وہ ضعیف کی کیا مدد کر سکتا ہے؟ سلطنت ترکیہ دم توڑ رہی تھی، ہندوستان کے مسلمان بھی بے بس اور مجبور تھے، نہ ان کی سیاست مستحکم تھی نہ معیشت مستحکم تھی اور نہ دینی و اخلاقی حالت ہی اچھی تھی۔ ایسی صورت میں جان و مال کی بازی لگانا خود کو ہلاک کرنا تھا۔ اس لئے دیدہ ور مدبروں نے یہی کہا کہ مسلمان جذبات میں آکر خود کو ہلاک نہ کریں۔ ترکیہ کی جتنی مدد کرسکتے ہیں کریں۔ انہوں نے اس حقیقت کو واشگاف بتایا کہ سلطنتِ ترکیہ خلافتِ اسلامیہ نہیں جس کی حفاظت ہر مسلمان پر فرض ہے، یہ محض ایک مسلمان سلطنت ہے جس کی امداد حسبِ استطاعت ہر مسلمان پر واجب ہے۔

تحریکِ خلافت کا اصل مقصود انگریزوں سے انتقام لینا اور ہندوستان کی آزادی کیلئے ان کو مجبور کرنا تھا اس میں ہندو اور قوم پرست مسلمان دونوں شریک تھے اور اہلِ سنت اس لئے شریک تھے کہ بظاہر تحریک ایک ایسی سلطنت کی حمایت میں تھی جو عقائد اہل سنت کی پاسدار تھی۔

تحریکِ خلافت کے پوشیدہ مقاصد

لیکن انگریزوں سے انتقام لینے اور ہندوستان کی آزادی کیلئے انگریزوں کو مجبور کرنے کے علاوہ تحریکِ خلافت کے کئی اور پوشیدہ مقاصد بھی تھے، مثلاً:

الف ﴾ ہندوؤں کو مسلمانوں کے قریب لانا اور اس باہمی اتحاد سے کانگریس کو، جو ہندوؤں کی ایک کمزور سیاسی جماعت تھی، قوی کرنا۔

ب ﴾ کانگریس کی خفیہ مالی امداد کرنا۔

ج ﴾ مسلمانوں کو زندگی کی ہر سطح پر کمزور کرنا۔

د ﴾ بدعقیدہ اور وہابیہ (جو مسلمانوں کی نظر میں باوقار نہ تھے) کا وقار بلند کرنا۔

ہ ﴾ اہل سنت کے اکابر علماء و مشائخ (جو مسلمانوں کو ہندوؤں اور قوم پرست لیڈروں کے پوشیدہ مقاصد سے باخبر کر رہے تھے) کو بدنام کرنا اور ان کی کردار کشی کرنا۔

اب ہم ترتیب وار ان مقاصد پر مختصراً روشنی ڈالتے ہیں:۔

﴿ الف ﴾

ہندو اپنی علیحدگی پسند طبیعت اور مسلمانوں سے عناد و نفرت کی وجہ سے الگ سے ہوگئے تھے۔ یہ علیحدگی سیاسی حیثیت سے ان کیلئے مہلک تھی۔ ان کے پاس مال تو تھا مگر جذبہ و حوصلہ نہ تھا اور سیاست میں دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس علیحدگی کے اور بھی اسباب تھے مثلاً:

1. ہندوؤں نے اُردو کے خلاف مہم چلائی،
2. پھر یوپی میں ملازمت کیلئے ہندی کو لازم کرایا،
3. اس کے بعد بنگال کی تقسیم کو ختم کرایا۔

جس سے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا، یہ سارے واقعات ۱۸۶۷ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیان واقع ہوئے۔ ان واقعات سے مسلم زعماء یہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ ہندو مسلمانوں کے ساتھ پُر امن وطنوں کی طرح نہیں رہنا چاہتے بلکہ مسلمانوں پر حکومت کرنے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور اپنے اس دیرینہ مخدوم کو خادم بنانے کی فکر میں ہیں جس نے پاک و ہند پر ایک ہزار سال حکومت کی اور اسلامی رواداری کی شاندار مثال قائم کی۔ اس سوچ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج کو اور وسیع کر دیا۔ اور مسلمان زعماء علیحدگی کے مسئلے پر سنجیدگی سے سوچنے لگے جن میں سر سید احمد خاں، عبدالحلیم شرر، حسرت موہانی، عبدالقدیر بلگرامی، عبد الستار خیری، علامہ اقبال وغیرہ بہت سے زعماء شامل ہیں۔ جب مسلم زعماء کی طرف سے علیحدگی کی باتیں ہونے لگیں۔ ہندو لیڈروں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے تعاون کے بغیر وہ آزادی کی جنگ نہیں جیت سکتے اور اپنے عزائم میں ہرگز کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اسی زمانے میں تحریکِ خلافت شروع ہوئی اور جذبات کا ایک طوفان اُمنڈ آیا۔ موقع سے فائدہ اُٹھاکر ہندوؤں نے پہل کی اور گاندھی، تحریکِ خلافت میں شامل ہوگئے، جن کا مسلمانوں نے نہایت گرم جوشی سے استقبال کیا بلکہ فرطِ محبت میں ان کو اپنا پیشوا بنالیا۔ علماء تک ان کے قدم بہ قدم چلنے لگے اس سے فائدہ اُٹھاکر گاندھی نے دوسرے ہی سال ۱۹۲۰ء تحریک ترکِ موالات شروع کردی (یعنی انگریزوں سے ہر قسم کا مکمل بائیکاٹ)۔ یہ تحریک ایک طرف انگریزوں سے ترکِ موالات کی تحریک تھی تو دوسری طرف ہندوؤں سے موالات اور دوستی واُخوت کی تحریک۔ چنانچہ اسی زمانے میں "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے خوب نعرے لگے اور مسلمان قریب سے قریب آگئے۔ گاندھی کا مقصود یہی تھا۔ مسلمان اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے اپنی پیشانیوں پر قشقہ لگوایا، مندروں میں گئے، ارتھیوں کو کندھا دیا، گائے کی قربانی چھوڑدی وغیرہ وغیرہ۔ اس صورت حال سے دو قومی نظریہ کا تصور ابھر کر سامنے آیا۔ حقیقت میں یہ نظریہ تو ایک قدرتی نظریہ ہے جو اسلام نے پیش کیا ہے لیکن ہندوستان میں مختلف ادوار میں مختلف اکابرین نے اس نظریہ کا احیاء کیا مثلاً حضرت مجدد الف ثانی، امام احمد رضاخاں بریلوی اور سلطانُ العلماء حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑوی (رحمہم اللہ تعالیٰ) وغیرہ وغیرہ۔

تحریکوں کے درمیان ابھرنے والے بعض مسائل

تحریکِ خلافت، تحریکِ ترکِ موالات، تحریک ہجرت اور تحریک کھدر وغیرہ نے بعض شرعی مسائل پیدا کردیئے چنانچہ سلطانُ العلماء سے مندرجہ ذیل سوالات کئے گئے:۔

﴿سوالات﴾

1 کیا حکومت ترکیہ شرعاً خلافتِ اسلامیہ ہے؟

2 کیا ہندوستان دار الحرب ہے اور یہاں سے ہجرت کر جانا مسلمانوں پر واجب ہے؟

3 کیا تحفظ خلافت کیلئے کانگریس کا تعاون اور گاندھی کی قیادت جائز ہے؟

4 کیا مسلمانوں پر انگریزوں سے مطلقاً عدم تعاون فرض ہے؟

5 کیا ہندوؤں کی خوشنودی اور تعاون حاصل کرنے کیلئے گائے کی قربانی ترک کرنا جائز ہے؟

6 کیا صرف کھدّر کے کپڑے پہننا ضروری ہیں؟

﴿ جوابات ﴾

1 پہلے سوال کا سلطانُ العلماء نے یہ جواب دیا کہ اسلامی خلافت صرف تیس برس رہی، اس کے بعد سلطنت ہو گئی، لہٰذا سلطنتِ ترکیہ، خلافتِ اسلامیہ نہیں۔

2 دوسرے سوال کے بارے میں آپ کا موقف یہ تھا کہ ہجرت کے جواز کی کوئی وجہ کتاب وسنت اور دیگر دلائل شرعیہ سے نہیں ملتی۔ بالفرض ہجرت فرض بھی ہوئی تو دنیا میں کوئی مسلمان ملک اتنا بڑا نہیں جہاں ہندوستان کے کروڑوں مسلمان جاکر آباد ہو سکیں اس لئے عدم استطاعت کی وجہ سے بھی یہ فرض ساقط ہے۔

آپ نے فرمایا کہ اس غیر شرعی ہجرت کا نتیجہ بہت خراب نکلے گا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ افغانستان جانے والے مہاجرین اپنا سب کچھ اونے پونے ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر کے چلے گئے وہاں جاکر پریشان وپشیمان ہوئے اور بالآخر خستہ حال واپس لوٹے۔

3 تیسرے سوال کے بارے میں حضرت سلطانُ العلماء کا یہ موقف تھا کہ گاندھی کی قیادت ناجائز ہے اس لئے کہ مسلمانوں کو چار اُمور پر عمل پیرا ہونے کا حکم ہے۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماعِ اُمت، اقوال مجتہدین۔ گاندھی کی اتباع کا کہیں حکم نہیں آتا ہندوؤں سے موالات بھی جائز نہیں۔

4 چوتھے سوال کے جواب میں فرمایا، یہود و نصاریٰ اور مشرکین کی عداوت قرآن میں صراحۃً مذکور ہے۔ پس یہود و نصاریٰ، کافر و مشرک سب سے ترکِ موالات ہونی چاہئے۔

5 پانچویں سوال کے بارے میں آپ کا موقف یہ تھا کہ احادیث میں گائے کی قربانی کی خوبیاں اور فضیلت مذکور ہیں اس لئے کسی کی خوشنودی اور تعاون حاصل کرنے کیلئے اس کو ترک کرنا جائز نہیں۔

6 چھٹے سوال کے بارے میں فرمایا کہ قرآن اور حدیث و فقہ کی کتابوں میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ مگر تعجب ہے کہ مولوی حسین احمد دیوبندی نے گاندھی کے اس حکم کو کہ کھدّر ہی پہننی چاہئے اور کچھ نہیں، حکمِ شرعی سمجھا، زندگی بھر خود پہنا اور دوسروں کو پہنایا، عجیب تر یہ کہ جس میت کو کھدر میں نہ کفنایا جاتا، اس کی نمازِ جنازہ نہیں پڑھاتے تھے۔ سندھ کے فاضل جلیل مولانا محمد ہاشم جان سرہندی علیہ الرحمۃ راقم سے فرماتے تھے کہ تحریک کھدّر کے زمانے میں مولوی حسین احمد سندھ تشریف لائے اور ایک مجلس میں جہاں مولانا موصوف بھی موجود تھے، علماء کے سروں سے عمامے اُترواکر کھدر کی ٹوپیاں پہنائیں جس کو "گاندھی کیپ" کہا جاتا تھا۔ (اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ)

حضورِ انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "جب مسلمانوں کے سروں سے عمامے اتر جائیں گے تو ان کی ہیبت و عظمت جاتی رہے گی"۔ سچ فرمایا بے شک ایسا ہی ہوا۔

تحریکِ خلافت کے قائدین نے حضرت سلطانُ العلماء سے مراسلت بھی کی اور خود ملنے بھی آئے۔ چنانچہ مولانا عبد الباری فرنگی محلی نے جو اہل سنت کے ایک تبحر عالم اور تحریکِ خلافت کے قائد تھے، مراسلت کے ذریعے تحریک ہجرت کے متعلق استفسارات کیے۔ مولانا ظفر علی خاں ۱۹۲۰ء میں خلافت و ہجرت پر گفتگو کرنے کیلئے خود گولڑہ شریف حاضر ہوئے اور حضرت سلطانُ العلماء نے شرعی دلائل سے ان مسائل پر گفتگو فرمائی۔ مولانا خاموش ہوگئے اور دعا کی درخواست کی۔ اسی زمانے میں ابوالکلام آزاد کا ایک مضمون چھپا تھا جس میں انہوں نے سورۂ یوسف کی مندرجہ ذیل آیت کو خود پر منطبق کرتے ہوئے یہ اشارہ کیا کہ گویا وہ ہدایت پر ہیں:۔

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ (پ۱۳۔ سورۂ یوسف: ۱۰۸)

"کہہ دو میرا اور میرے تابعداروں کا بصیرت کے ساتھ یہ راستہ ہے کہ میں لوگوں کو اللہ کی طرف بلا رہا ہوں۔"

حضرت سلطانُ العلماء نے اثنائے گفتگو مولانا ظفر علی خاں سے فرمایا:۔

"بعض لوگ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے مدعی ہیں کہ وہ ان معاملات میں بصیرت پر ہیں لیکن اگر کوئی سوال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں "بصیرہ" کو نکرہ کیوں کہا اور معرفہ (البصیرۃ) کیوں نہیں فرمایا تو اس کی وجہ بیان نہیں کریں گے۔"[1]

مولانا ظفر علی خان گولڑہ شریف سے جب واپس راولپنڈی آئے تو وہاں ابو الکلام آزاد سے ان کی ملاقات ہوگئی جو انھیں مسائل پر گفتگو کرنے کیلئے گولڑہ شریف جانے والے تھے۔ مولانا ظفر علی خان نے فرمایا:۔

"اگر آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ "بصیرہ" کو اللہ تعالیٰ نے "نکرہ" کیوں فرمایا اور "معرفہ" کیوں نہ فرمایا تو ضرور جایئے۔"

مگر سلطانُ العلماء کا اندازہ صحیح تھا، یہ نکتہ ابو الکلام آزاد کی سمجھ سے بالاتر تھا اس لئے وہ گولڑہ شریف نہ گئے اور راولپنڈی سے واپس چل دیئے۔ اسی زمانے میں بریلی کے ایک سیاسی جلسے میں بھی امام احمد رضاں خاں بریلوی کے خلیفہ علامہ سیّد محمد سلیمان اشرف بہاری اور صاحب زادہ حجۃ الاسلام مولانا محمد حامد رضا خاں بریلوی کے سامنے بھی وہ نہ بول سکے۔ اس میں شک نہیں علماء حق کی شخصیتیں بڑی قد آور ہیں افسوس ہمارے تحقیقی اداروں اور جامعات میں ان پر تحقیق نہیں ہوئی اور ہوتی بھی ہے تو شاذ و نادر۔

---

[1] فیض احمد فیض، مولانا: مہر منیر، ص ۲۷۷۔ مطبوعہ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء۔

حضرت سلطانُ العلماء اور دوسرے علماء حق نے تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات کے خلاف جو عاقبت اندیشانہ فتوے دیئے مستقبل کے حالات وحادثات نے اس کی توثیق کی، پھر کفار و مشرکین کا دم بھرنے والے بعض مسلمان لیڈروں کے ایسے تیور بدلے کہ وہ پہچانے بھی نہیں گئے۔ چنانچہ آرہ میں جب مسلمانوں پر مظالم ہوئے تو وہی مولانا عبد الباری فرنگی محلی جو گاندھی کی قیادت کو سعادت سمجھتے تھے ہندوؤں کو بایں الفاظ تنبیہ فرمارہے تھے:۔

"ہندو باز نہ آئے تو میں ان کے خلاف عام جہاد کا فتویٰ جاری کروں گا۔" [۱]

مولانا ظفر علی خان جو تحریکِ خلافت کے سرگرم رکن تھے اور کانگریس کے دمساز۔ انہوں نے کراچی میں کانگریس کے اجلاس میں نمازِ مغرب کیلئے وقفہ چاہا، گاندھی نے انکار کر دیا اور اجلاس جاری رہا۔ بس پھر کیا تھا مولانا اجلاس سے اُٹھ کر چل دیئے اور گاندھی کی ہجو لکھی، جس کا ایک بند ملاحظہ ہو ؎

اے سامری وقت کہ گاندھی ہے تیرا نام
کہتے ہیں نصاریٰ کا تجھے بندۂ بے دام
ہندو کو مسلمان سے لڑانا ہے ترا کام
ہم کو نظر آتا ہے جو ہوگا ترا انجام
اے دشمنِ اسلام! [۲]

مولانا ظفر علی خاں نے اس بند میں گاندھی کو جوان القاب سے نوازا ہے:۔

سامری وقت، نصاریٰ کا بندۂ بے دام، ہندو مسلم فساد کا ذمہ دار، دشمنِ اسلام ـــــ تو اس کے پیچھے پوری ایک تاریخ ہے۔ یہ محض جذباتی اُبال نہ تھا۔

---

[۱] فیض احمد فیض، مولانا: مہر منیر، ص۲۷۶۔ مطبوعہ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء۔

[۲] فیض احمد فیض، مولانا: مہر منیر، ص۲۷۸۔ مطبوعہ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء۔

ب

تحریکِ خلافت اور تحریک ترکِ موالات کے پوشیدہ مقاصد پر بحث کرتے ہوئے ہم نے اوپر ایک مقصد کا ذکر کیا ہے یعنی ہندوؤں کو مسلمانوں کے قریب لاکر اس باہمی اتحاد سے سیاسی منافع حاصل کرنا اور کانگریس کو قوی کرنا۔ اب دوسرے مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یعنی تحریکِ خلافت میں جمع ہونے والے چندے سے کانگریس کی خفیہ مالی امداد کرنا۔

سیاسی تحریکوں میں چندہ مانگنا ایک فن ہے جس طرح آج کل خریداروں کو غیر ضروری خرید و فروخت پر اکسانا ایک فن بن گیا ہے، اسی طرح قدرتی حادثات پر ایک ملک کا دوسرے ملکوں سے امداد طلب کرنا بھی ایک فن بن گیا ہے۔ بہر کیف کانگریس کو اپنی قوت کیلئے افراد کی بھی ضرورت تھی اور اموال کی بھی۔ ہندو مسلم اتحاد سے افرادی قوت حاصل کی، مسلمان جوق در جوق کانگریس میں شامل ہوئے پھر جمعیۃ العلماء ہند اور بعد میں مجلس احرار وغیرہ کا تعاون بھی زندگی بھر ان کے ساتھ رہا۔ ہاں مالی قوت کی ضرورت تھی وہ تحریکِ خلافت کا ساتھ دے کر حاصل کرلی گئی۔ اس تحریک میں پاک وہند کے طول و عرض میں مسلمانوں نے دل کھول کر چندہ دیا، عورتوں نے زیورات تک دیے، یہ سب کانگریس کے کام آئے، یہ ایک خفیہ راز ہے جس کا انکشاف کانگریس کی مخالف سیاسی جماعتوں نے کیا اور بعد میں خود گاندھی نے بھی اس کا اعتراف کیا کہ تحریکِ خلافت میں جمع ہونے والا چندہ کانگریس کے کام آیا۔ آپ نے ملاحظہ فرمایا، اللہ کی مخلوق کو کس طرح بیوقوف بنایا گیا اور اپنے پوشیدہ مقاصد حاصل کیے گئے۔

مسٹر گاندھی اپنی قوم کے نہایت مخلص قائد تھے مگر ان کی قوم نے قدر نہ کی اور بالآخر قتل کر دیا۔ ایسا مخلص انسان کسی قوم کو مل جائے تو وہ پستی سے بلندی کی طرف جاسکتی ہے۔ بے شک وہ اپنی قوم سے مخلص تھے مگر مسلمان قوم سے ان کا تعلق محض مصلحت اندیشانہ تھا گو نظر یوں آتا ہے کہ وہ ملتِ اسلامیہ سے مخلص ہیں۔ انہوں نے پہلے ہندوؤں کو مسلمانوں سے قریب کر کے افرادی قوت حاصل کی، پھر مالی قوت حاصل کی۔ مگر سیاسی اور معاشی قوت حاصل کرنے کیلئے یہ بھی ضروری تھا کہ مسلمان قوم کے مذہبی، ثقافتی، سیاسی اور معاشی حالات خوبصورتی سے تباہ کر دیئے جائیں۔ قوم کی بقاء کا انحصار مذہبی تصلب اور معاشی استحکام پر ہے۔ گاندھی نے ان دونوں کو ہدف بنایا۔ ہندو مسلم اتحاد سے مذہبی تصلب ختم کیا، مسلمان شعائر اسلام کو چھوڑ بیٹھے اور مشرکانہ شعائر اپنائے۔ حتیٰ کہ گاندھی کو بزرگ ترین خلائق اور نبوت کا مستحق سمجھنے لگے۔ ترکِ موالات کی تحریک چلا کر مسلمانوں کو معاشی طور پر کمزور کر دیا انہوں نے انگریزوں کے خطاب و تمغات واپس کیے، ملازمتیں چھوڑیں، جاگیریں چھوڑیں وغیرہ وغیرہ پھر تحریک ہجرت چلائی، مسلمانوں کے پاس جو کچھ تھا وہ اونے پونے ہندوؤں کے ہاتھ فروخت کر کے افغانستان جانے لگے۔ تحریک کھدر چلائی، پاک و ہند میں جو مسلمان نفیس کپڑا بناتے تھے ان کا کاروبار ختم ہو گیا، تحریک گاؤکشی اور ترک حیوانات چلائی جس سے مسلمان قصابوں کا کاروبار ختم ہوا اور آخر میں ۱۹۲۳ء میں تحریک شدھی، سنگھٹن چلائی جس کا مقصود مسلمانوں کو مرتد بنانا اور ہندو تہذیب و ثقافت کو ان پر مسلط کرنا تھا۔ ان تمام تحریکوں سے مسلمان کمزور سے کمزور تر ہوتے گئے اور ان کی قربانیاں اور توانائیاں ہندوؤں کے کام آتی گئیں۔ اس میں شک نہیں مسٹر گاندھی اپنی قوم کی طرف سے شکریہ اور مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انہوں نے نہایت خوبصورتی سے اپنا اہم کام کیا جو ایک غیر مسلم سیاست داں کے بس کی بات نہ تھی۔ خوبصورتی سے اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اس ساری تباہی کے بعد مسلمان گاندھی کو نہ صرف اپنا خیر خواہ بلکہ مسلمان سمجھنے لگے اور مسلمان بھی ایسے ویسے مسلمان نہیں بلکہ "ولی اللہ"۔ اسی لئے آج تک ان کیلئے قرآن خوانی اور ایصالِ ثواب ہوتا ہے اور لطف یہ ہے کہ یہ کام وہ لوگ کرتے ہیں جو اس عمل کو ناجائز و حرام تصور فرماتے ہیں مگر گاندھی کیلئے یہ سب کچھ جائز ہے۔ مسلکِ دیوبند کے اکثر علماء پر گاندھی کا جادو چل گیا اِلّا ماشاء اللہ! مگر علماء اہل سنت ہوشیار ہو گئے اور پھر اس کوچے کا رُخ نہ کیا جہاں ان کی تباہی کیلئے سازشیں تیار کی جارہی تھیں۔

تحریکِ خلافت سے یہ منافع تو ہندوؤں نے حاصل کئے۔ بعض منافع علماء دیوبند اور علماء وہابیہ نے بھی حاصل کئے، جس کی تفصیل یہ ہے:۔

سلطنتِ عثمانیہ ایک متصلّب سُنّی سلطنت تھی۔ یہی وہ سلطنت تھی جس نے گنبدِ خضراء کی تعمیر کی اور حرمین شریفین میں ازواجِ مطہرات وصحابہ کرام کے مزارات پر بکثرت قبے بنوائے جو بعد میں ابنِ سعود نے ڈھادیے۔ یہ ایک خونچکاں داستان ہے۔ جس زمانے میں تحریکِ خلافت چلی اس سے کچھ قبل علماء دیوبند اور علماء وہابیہ کے خلاف علماء اہل سنت نے جناب رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میں ان کی گستاخانہ عبارات کے خلاف ایک بھرپور مہم چلائی تھی جس سے ان کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا۔ اوران کو مجبوراً اور مصلحتاً ان افکار وعقائد کو تسلیم کرنا پڑا جو ان کے خیال میں ناجائز وحرام تھے۔ جیسا کہ المهند (مصنف مولانا خلیل احمد انبیٹھوی) کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے۔ اپنے وقار کو قائم کرنے کیلئے انہوں نے مناسب خیال کیا کہ ایک سُنّی سلطنت کی حمایت کی جائے تاکہ پاک وہند کے مسلمان (جن کی اکثریت عشقِ رسول کی پاسدار ہے) قریب آجائیں اور ان کے دل ان کی طرف سے صاف ہوجائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور وہ سنّی مسلمان جو کچھ عرصہ پہلے علماء دیوبند اور علماء وہابیہ سے وحشت زدہ تھے شیر وشکر ہوگئے اور اس حد تک قریب آگئے کہ اپنوں کو بھی چھوڑ بیٹھے۔ لیکن جب مصطفیٰ کمال نے سلطان ترکی عبد الحمید خان کو جلاوطن کرکے جمہوری حکومت قائم کی، علماء دیوبند اور علماء وہابیہ نے مبارکباد کے تار بھیجے (کہ آج ایک سنّی سلطنت ختم ہوگئی)۔ یہ نظارہ دیکھ کر وہ اہل سنت جو اپنے مخدوموں کو چھوڑ بیٹھے تھے سخت نادم ہوئے اور تائب بھی۔

دشمن جب انتقام لیتا ہے تو حد سے گزر جاتا ہے پھر اس کو شریعت کا بھی پاس نہیں رہتا، جدھر نفس چلاتا ہے ادھر چلتا ہے۔ اہل سنت کے مخالفین نے اسی پر بس نہیں کیا کہ سلطنتِ عثمانیہ کی حمایت سے عوام میں اپنا وقار بحال کیا بلکہ ایک قدم اور بڑھایا اور ایک ایسا مسئلہ پیدا کیا جس سے ان کی نظر میں اکابر اہل سنت کی بدنامی یقینی تھی۔ وہ مسئلہ تھا خلافت اور سلطنت کا مسئلہ۔ از روئے شرع سلطنت ترکی خلافتِ اسلامیہ نہ تھی لیکن علماء دیوبند نے اس یقین کے ساتھ اس کو خلافتِ اسلامیہ قرار دیا کہ اکابر اہل سنت ضرور اس خیال کی مخالفت کریں گے بس یہی موڑ ہو گا جہاں سے ان کے خلاف پروپیگنڈے کا آغاز کیا جائے چنانچہ یہی ہوا۔ اکابر اہل سنت امام احمد رضا خاں بریلوی، سلطانُ العلماء پیر مہر علی شاہ گولڑوی وغیرہ نے اس خیال کی سخت مخالفت کی بس پھر کیا تھا ان کے خلاف ایک طوفان کھڑا کر دیا اور ان کو بدنام کرنے کیلئے ایک بھرپور مہم چلائی گئی۔ چونکہ عوام جذباتی ہو رہے تھے اور انگریزوں کے خلاف تھے اس لئے یہ مشہور کیا گیا کہ یہ حضرات انگریزوں کے خیر خواہ ہیں۔ اس جذباتی دور میں یہ خیر خواہی بدترین جرائم میں تھی اس لئے یہ حضرات خوب بدنام ہوئے۔ حضرت سلطانُ العلماء پر بھی یہ الزام لگایا گیا حالانکہ آپ حکومتِ برطانیہ کی دعوت پر ۱۹۱۱ء میں دہلی دربار میں تشریف نہیں لے گئے تھے۔ اس وقت یہ تحریک بھی نہ چلی تھی۔ پھر ۱۹۱۴ء میں جنگِ عظیم شروع ہوئی اور راولپنڈی کے انگریز کمشنر نے یہ درخواست کی کہ آپ اپنے حلقۂ ارادت میں برطانوی فوج میں بھرتی کی ترغیب دیں تو آپ نے صاف صاف لکھ دیا:۔

"دائرۂ اسلام سے خارج ہو کر آپ کے پیغام کی تعمیل بالکل ناممکن ہے۔" [۱]

حالانکہ اس وقت مسٹر گاندھی اور محمد علی جوہر ہندوؤں اور مسلمانوں کو فوج میں بھرتی کرا رہے تھے۔

---

[۱] فیض احمد فیض، مولانا: مہر منیر، ص ۲۷۸۔ مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء۔

تقسیمِ ہند کی دو ٹوک بات

بہر کیف جب مسلم زعماء پر ہندو لیڈروں کے عزائم کھل کر سامنے آگئے تو تقسیم ہند کی کھلم کھلا بات ہونے لگی، چنانچہ ۱۹۲۵ء میں عبدالقدیر بلگرامی نے تقسیم ہند کی نہایت ہی مفصل تجویز پیش کی پھر ۱۹۳۰ء میں ڈاکٹر محمد اقبال نے سیاسی پلیٹ فارم سے یہ تجویز پیش کی اور بالآخر ۱۹۴۰ء میں قرار دادِ پاکستان پاس ہوئی [۱] اور ملک کے طول و عرض میں پاکستان کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ جمعیۃ علماء ہند، مجلس احرار وغیرہ جو مسلک دیوبند کے علماء و عوام پر مشتمل تھیں مطالبہ پاکستان کے سخت خلاف تھیں اور کانگریس کی پر زور حامی۔ ہاں علماء اہل سنت جو پاک و ہند میں اکثریت رکھتے تھے پاکستان کے حامی تھے اِلّا ماشاء اللہ!

یہ عجائباتِ عالم میں سے ایک عجوبہ ہے کہ اہل سنت و جماعت جن پر وقتاً فوقتاً شرک و بدعت کا الزام لگتا رہا وہ کفار و مشرکین سے علیحدہ رہے اور جو یہ الزام لگاتے رہے اور اب بھی لگاتے ہیں کفار و مشرکین ہند کے ساتھ رہے اِلّا ماشاء اللہ! یہ ایک ایسا معمّہ ہے جو حل نہیں ہو پاتا۔ اور وہ ایک ممتاز عالم جو ۱۹۴۶ء کے لگ بھگ ساتھ ہوئے وہ تقریباً تیس ۳۰ سال جمعیۃ علماء ہند میں رہے جو کانگریس کی حامی و مددگار رہی، بعض محققین کی نظر میں ان کا ساتھ دینا بھی حکمت سے خالی نہ تھا اصل مقصود پاکستان میں اپنے مسلک کی اشاعت اور اپنے لوگوں کی سرفرازی تھا جو ساتھ نہ دینے کی صورت میں ممکن نہ تھا چونکہ ان حضرات کا تعلق جمعیۃ علماء ہند اور کانگریس سے رہا اس لئے ان کی وساطت سے وہ تمام لوگ رفتہ رفتہ پاکستان آگئے اور ان کا مشن یہ رہا کہ:

- حکومت کے اندر و باہر ہر سطح پر اہل سنت کی کاٹ کی جائے،
- پاکستان کی تاریخ کو اپنے مزاج کے مطابق بنایا جائے،
- قوم پرست علماء کا بہترین انداز میں تعارف کرایا جائے۔

چنانچہ یہ مقاصد حاصل کیے گئے، حال ہی میں اسلام آباد سے جمعیۃ علماء ہند کی تاریخ شائع ہوئی ہے۔ اہل سنت و جماعت کی ہمہ گیر حمایت سے بیرونی ممالک کے فضلاء پر یہ تاثر قائم ہے کہ شاید یہاں ہر سطح پر اہل سنت و جماعت کا عمل دخل ہے چونکہ دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ تحریک میں جس مزاج کی اکثریت ہوتی ہے وہی حکومت بناتی ہے۔

حضرت سلطانُ العلماء ایک دیدہ ور مدبر تھے، جس راہ پر انہوں نے چلایا وہ مشرکین ہند سے موالات و مواخات کی راہ نہ تھی بلکہ اسلام کی سچی اور سیدھی راہ تھی۔ آپ کی نگاہ ماضی کے حادثات پر بھی تھی اور مستقبل کے متوقع واقعات پر بھی۔ وہ سمجھتے تھے اسلام قوت اور زندگی کا نام ہے۔ خود قرآن فرما رہا ہے:۔

"اگر تم سچے اور پکے مسلمان بنے رہے تو سارے عالم پر چھائے رہو گے۔"

آپ نے کسی ایسی بات کی تعلیم نہ دی جو مسلمانوں کو قوت اور زندگی سے محروم کر دے اسی لئے آپ نے اپنے زمانے میں اُٹھنے والی ان باطل قوتوں کا پوری استقامت کے ساتھ مقابلہ کیا جو مسلمانوں کو قوت اور زندگی سے محروم کرنے پر تلی ہوئی تھیں۔

---

[۱] اس موضوع پر ادارہ مظہر اسلام، لاہور ۲۰۰۰ء میں پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد صاحب کا تحقیقی مقالہ "تصورِ پاکستان، ایک تحقیقی جائزہ" شائع کر چکا ہے۔ نقش ثانی مع اضافات ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔

وصالِ پُر ملال

آپ نے زندگی بھر مسلک حقہ اور عقائد صحیحہ کی تعلیم دی، عشقِ مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا چراغ روشن کیا، تاریک دِلوں کو روشن کیا پھر مولا کے حضور حاضری کی تیاریاں شروع کر دیں۔

۱۳۴۷ھ / ۱۹۲۸ء تک حضرت سلطان العلماء کی صحت اچھی رہی یعنی تقریباً ۷۲ سال کی عمر تک، پھر ضعف و نقاہت کے آثار نمایاں ہونے لگے، اسی زمانے میں ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم نے حقیقت زماں سے متعلق آپ سے استفسار بھی کیا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا استغراق کی کیفیت بڑھتی گئی اور ایسا استغراق میسر آیا کہ اولاد کی صورتیں بھی صفحۂ دل سے محو ہو گئیں اپنے اور بیگانے میں تمیز نہ رہی۔ نظروں میں وہی وہ سما گیا۔ ہمہ وقت ذکر و اذکار۔ اور قرآن کی سماعت میں مصروف رہتے کہ اللہ کی یاد کا بہترین طریقہ یہی ہے۔ نو دس سال اسی ذکر و اذکار میں گذر گئے، بالآخر وہ وقت آیا جو آنے والا تھا۔ ۲۹/ صفر المظفر ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۱/ مئی ۱۹۳۷ء بروز سہ شنبہ تقریباً پچاس سال مسند ارشاد پر رونق افروز رہنے کے بعد اسی ۸۰ سال کی عمر شریف میں جان عزیز جاں آفریں کے سپرد کر دی۔

دل تو جاتا ہے اس کے کوچے میں
جا مری جان، جا، خدا حافظ

یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ ۲۹/صفر المظفر ۱۰۳۴ھ کو حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ کا وصال ہوا اور ۳۲۲ سال بعد ۲۹/ صفر المظفر ۱۳۵۶ھ کو سلطان العلماء حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ علیہ الرحمۃ کا وصال ہوا۔

اقبال نے حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ سے التجا کی تھی:۔

لا اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی!
ہاتھ آجائے مجھے میرا مقام اے ساقی!
تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے تیرا فیض ہو عام اے ساقی!

یہ التجا قبول ہوئی اور یہ فیض عرفانی جاری و ساری ہوا۔۔۔۔ ہاں ؎

جام پہ جام لائے جا شان کرم دکھائے جا
پیاس مری بڑھائے جا، روز نئی پلائے جا

حضرت سلطانُ العلماء کا وِصال کیا ہوا پاک و ہند میں صف ماتم بچھ گئی۔ اخبارات و رسائل نے تعزیتی نوٹ اور تعزیتی اداریے شائع کیے جس میں موافق و مخالف سب ہی تھے اس سے آپ کی ہمہ گیر مقبولیت اور مصلحانہ و مرشدانہ شان و شوکت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شیخ محمد علی مدنی رفاعی نے عربی میں آپ کا مرثیہ لکھا جس میں آپ کی مصلحانہ شان کا اسی طرح ذکر کیا ہے:۔

وکم رددت علی الزائغلین

اھل البدع والضلال والفتون (ص۳۴۳)

(ترجمہ) اور بدعتیوں اور گمراہوں اور فتنہ بازوں کی کس قدر آپ نے تردیدیں فرمائیں!

سجادہ نشین

حضرت سلطانُ العلماء کے وصال کے بعد آپ کے فرزند رشید صاحب زادہ سیّد غلام محی الدین شاہ المعروف بہ بابو جی (م ۱۳۹۴ھ / ۱۹۷۴ء) سجادہ نشین ہوئے، آپ کے حالات بھی لائق ذکر و قابلِ مطالعہ ہیں۔ بیس پچیس سال قبل راقم گولڑہ شریف میں آپ کی زیارت سے مستفیض ہو چکا ہے، بڑا کرم فرمایا، اپنے پاس بٹھایا۔ آپ ۳۷ سال مسند ارشاد پر فائز رہے، آپ کے بعد آپ کے بڑے صاحب زادے حضرت مولانا شاہ معین الدین مدظلہ العالی مسند ارشاد پر رونق افروز ہوئے۔ آپ صاحبِ علم و فضل اور باکمال شاعر ہیں، آپ کے صاحب زادے سیّد شاہ غلام نصیر الدین زید مجدہ بھی عالم اور باکمال شاعر ہیں (مولانا شاہ معین الدین کے چھوٹے بھائی مولانا شاہ عبد الحق ہیں) الحمد للہ یہ خانقاہ آباد ہے اور ابھی یہاں علم و عرفان کی روشنی باقی ہے، اللہ تعالیٰ اس روحانی اور علمی فیض کو جاری و ساری رکھے۔ آمین

یادگار تصانیف

حضرت سلطانُ العلماء کی باقیات صالحات میں اولاد امجاد کے علاوہ چند تصانیف بھی ہیں، جن میں قابل ذکر یہ ہیں:۔

- تحقیق الحق فی کلمۃ الحق (۱۳۱۵ھ / ۱۸۹۷ء)
- شمس الہدایہ فی اثبات حیات المسیح (۱۳۱۷ھ / ۱۹۰۰ء)
- سیف چشتیائی (۱۳۱۹ھ / ۱۹۰۲ء)
- اعلاء کلمۃ اللہ فی بیان ما اھل بہ لغیر اللہ (۱۳۲۲ھ / ۵۔۱۹۰۴ء)
- الفتوحات الصمدیہ (۱۳۲۵ھ / ۸۔۱۹۰۷ء)
- تصفیہ مابین سنّی و شیعہ۔
- فتاویٰ مہریہ (۱۳۸۲ھ / ۱۹۶۰ء)

حاصل کلام

اہل اللہ کے ذکر و اذکار سے دل و دماغ دونوں قوی ہوتے ہیں۔ ہم نے قوت کے اس سر چشمے کو بھلا دیا۔ در در کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ گھر گھر سے بھیک مانگ رہے ہیں۔ عقل ماؤف ہو گئی، طاقت جواب دے گئی۔ دماغ چکرا رہا ہے، دل ڈوب رہا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ کیا ہو رہا ہے، یہ کیوں ہو رہا ہے؟ ہاں اے ڈوبنے والے! قرآن تم کو بلا رہا ہے اور اہل اللہ کے قدموں پر جھکا رہا ہے۔ جھک جاؤ کہ اسی جھکنے میں چین بھی ہے اور سکون بھی۔ قوت بھی ہے اور زندگی بھی۔ خوب یاد رکھو جہاں وہ جھکائے وہاں جھکنا کسی غیر کے آگے جھکنا نہیں۔ جھکنا تو جھکنا وہ کسی کے آگے سجدے کا بھی حکم دے (جو کھلا شرک معلوم ہوتا ہے) تو بھی چون و چرا کی گنجائش نہیں۔ جس نے چون و چرا کی مردود ابدی ہوا۔ کیا ابلیس کا انجام نہیں معلوم؟ اللہ کے لشکری بنو۔ جب سے تم نے انبیاء و اولیاء سے منہ پھیرا ہے اور ان کو اپنا جیسا سمجھا ہے، تمہاری ہوا اُکھڑ گئی ہے، تم زندگی سے محروم ہو گئے۔ بے جان ہو گئے اور بے جان پر ہر کوئی شیر ہوتا ہے۔ سارا عالم ہمارے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ ہم ایسے بے بس و مجبور کبھی نہ ہوئے تھے۔ یقیناً ہمارے افکار میں کچھ ہیر پھیر ہے اور ہمارے اعمال میں کچھ قصور ہے، ورنہ قوت بلائیں لیتی اور زندگی قدم چومتی۔ ہاں اہل اللہ کے قدموں پر جھک جاؤ کہ خود زندگی تمہارے قدم چوم لے اور کسی کو تمہاری طرف آنکھ اُٹھانے کا یارا نہ رہے۔ تمھیں سارے عالم پر بھاری رہو اور تمہارا بول بالا ہو۔ آمین ربّنا آمین!

دلِ مُردہ، دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے کہ اُمتوں کے مرضِ کُہن کا چارہ

محمد مسعود احمد عفی عنہ
پرنسپل گورنمنٹ ڈگری کالج
(ٹھٹھہ، سندھ۔ پاکستان)

۲۱ / اگست ۱۹۸۶ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نعت "اج سک متراں دی"

حضرت سیّدنا پیر مہر علی شاہ گیلانی گولڑوی قدس سرہ

اج سک متراں دی ودھیری اے	کیوں دلڑی اُداس گھنیری اے
لوں لوں وچ شوق چنگیری اے	اج نیناں لائیاں کیوں جھڑیاں
الطیف سریٰ من طلعته	والشذو بدیٰ من و فرته
فسکرت ھنا من نظرته	نیناں دیاں فوجاں سر چڑھیاں
مکھ چند بدر شعشانی اے	متھے چمکے لاٹ نورانی اے
کالی زُلف تے اکھ مستانی اے	مخمور اکھیں ہن مدھ بھریاں
دو ابرو قوس مثال دسن	جیں توں نوک مژہ دے تیر چھٹن
لباں سرخ آکھاں کہ لعل یمن	چٹے دند موتی دیاں ہن لڑیاں
اس صورت نوں میں جان آکھاں	جاناں کہ جان جہان آکھاں
سچ آکھاں تے ربّ دی شان آکھاں	جس شان تو شاناں سب بنیاں
ایہہ صورت ہے بے صورت تھیں	بے صورت ظاہر صورت تھیں
بے رنگ دسے اس مورت تھیں	وچ وحدت پھٹیاں جد گھڑیاں
دسے صورت راہ بے صورت دا	توبہ راہ کی عین حقیقت دا
پر کم نہیں بے سوجھت دا	کوئی ورلیاں موتی لے تریاں
ایہا صورت شالا پیش نظر	رہے وقتِ نزع تے روزِ حشر
وچ قبر تے پل تھیں جد ہوسی گذر	سب کھوٹیاں تھیسن تد کھریاں
یعطیك ربك داس تساں	فترضیٰ تھیں پوری آس اساں
لج پال کریسی پاس اساں	واشفع تشفع صحیح پڑھیاں
لاہو مکھ تو مخطط برد یمن	من بھانوری جھلک دکھاؤ سجن
اوہا مٹھیاں گالیں الاؤ مٹھن	جو حمراء وادی سن کریاں
حجرے توں مسجد آؤ ڈھولن	نوری جھات دے کارن سارے سکن
دو جگ اکھیاں راہ دا فرش کرن	سب انس و ملک حوراں پریاں
انہاں سکدیاں تے کرندیاں تے	لکھ واری صدقے جاندیاں تے
انہاں بردیاں مفت وکاندیاں تے	شالا آون وت بھی اوہ گھڑیاں